مولانا محمد طاسین

ربوٰ اور مضاربت میں فرق

اب میں حسب وعدہ اس بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام نے معاملہ ربوٰ کو کیوں حرام و ناجائز اور معاملۂ مضاربت کو کیوں حلال و جائز ٹھہرایا ہے اس کا اصل فلسفہ کیا ہے؟

اس سوال کی توضیح و تفصیل کے سلسلہ میں پہلی اور بنیادی بات جو ذہن نشین ہونا ضروری ہے یہ کہ اسلام میں معاشی حق کا تصور کیا ہے، یعنی یہ کہ اسلام میں کوئی شخص کس بنا پر کسی شے کا حقدار قرار پاتا ہے، کیونکہ جب تک معاشی حق کا وہ تصور متعین اور واضح طور پر سامنے نہ ہو جو اسلام کے نزدیک ہے معاشی عدل اور معاشی ظلم کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا جسے اسلام نے معاشی معاملات کے جواز و عدمِ جواز اور حلال و حرام کے تعین میں سامنے رکھا ہے اس لئے کہ عدل کی تعریف میں حق رسی اور ظلم کی تعریف میں حق تلفی جزو لاینفک اور ایک لازمی حصہ ہے، سامنے رکھنے کا مطلب یہ کہ جو معاشی معاملات اپنی حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے عدل کے مطابق تھے ان کو اسلام نے جائز ٹھہرایا اور جو معاملات معاشی ظلم و حق تلفی پر مبنی تھے ان کو اس نے حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔

قرآن و حدیث کے مطالعے اور غور و فکر سے معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم کے متعلق جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ کہ دنیا میں انسان کے لئے جو نفع بخش مادی اشیاء ہیں وہ دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو اب تک اپنی قدرتی حالت و شکل پر قائم و

© rasailojaraid.

برقرار ہیں' دوسری وہ جن کی انسانی تصرف سے قدرتی حالت وشکل بدل چکی اور اب وہ انسانوں کے درمیان خاص قدر وقیمت کی حامل ہیں' اول الذکر اشیاء کے متعلق اسلام کا اصول یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے انتفاع واستفادہ کے لئے عام ہیں ہر انسان ان کی قدرتی افادیت سے یکساں طور پر متمتع ومستفید ہو سکتا ہے ان میں سے کسی شے کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خاص طور پر میری ہے اور مجھے ہی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے' البتہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہل وسبقت کر کے ایسی اشیاء میں سے کسی شے کو اپنے تصرف میں لاتا اور دماغی و جسمانی سعی و محنت سے اس کے اندر ایسا رد وبدل کرتا ہے کہ اس شے میں قدرتی افادیت کے ساتھ ایک نئی افادیت پیدا ہو جاتی اور معاشرے میں اس کی ایک قدر و قیمت قائم ہوتی ہے تو یہ شے اس شخص کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتی اور اس کا حق قرار پاتی ہے جس کو حقِ ملکیت بھی کہا جاتا ہے اور اس حق کی بنیاد دراصل وہ سعی و محنت ہوتی ہے جس سے اس شے کی قدرتی حالت وشکل میں تغیّر وتبدل کے ذریعے ایک نئی افادیت اور قدر وقیمت وجود میں آئی' بالفاظ دیگر اس حق کی بنیاد قابل مشاہدہ وہ محسوس اثرات ہوتے ہیں جو کسی انسان کی سعی و محنت سے وجود میں آکر مختلف تغیرات وتبدلات کی شکل میں قدرتی اشیاء کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں چنانچہ جس قدرتی شے کے ساتھ کسی انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات قائم ہوں وہ شے اس انسان کے فائدہ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے اس کی دلیل یہ کہ قرآن مجید میں یہ اعلان ہے کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات اسی کے فائدہ کے لئے مخصوص ہیں وہی ان سے فائدہ اٹھانے کا حقدار ہے دوسرا کوئی اس کی اجازت کے بغیر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا' مثال کے طور پر سورۃ النجم کی آیت ہے وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اور یہ کہ نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہ جو اس کی سعی سے وجود میں آیا۔

© rasailojaraid.c

اس آیت سے بہرحال یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات اسی کے ہیں اور وہی ان کا مالک اور حق دار ہے دوسرا کوئی ان کا مالک و حق دار نہیں لہٰذا اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر دوسرا کوئی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

قرآن مجید کا یہ تصور کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات اس کے لئے مخصوص ہیں انسانی فطرت، عقل و قیاس اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے، غور سے دیکھا جائے تو ایک انسان اپنے اختیار و ارادے سے جو بھی سعی و عمل کرتا ہے وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچے گا، دراصل فائدے کا شعور ہی وہ محرک ہوتا ہے جو اس کو اس سعی و عمل پر آمادہ کرتا ہے یہ فائدہ مادّی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی، وہ بظاہر جو کام و عمل دوسروں کے لئے کرتا ہے اس کی تہہ میں بھی یہ محرک کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے مثلاً مجھے اللہ کی رضا و خوشنودی، یا لوگوں میں شہرت و عزت یا قلبی سکون و اطمینان کی نعمت حاصل ہوگی، یہ دراصل انسانی فطرت ہے جسے کبھی بدلا نہیں جا سکتا، پھر جب یہ واقعہ ہے کہ انسان اپنے اختیار و ارادے اور علم و شعور سے جو اچھا اور مفید کام و عمل کرتا ہے اپنی ذات کے فائدہ کے لئے کرتا ہے تو عقل و دانش اور عدل و انصاف کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ اس کام و عمل کے مفید اثرات اس کے لئے مخصوص ہوں اس لئے بھی کہ کام و عمل کے کرنے میں جس نے تکلیف اٹھائی اور اپنی انرجی و توانائی صرف کی ہے وہی اس کے مفید اثرات کا بطور جزاء مستحق بھی ہو سکتا ہے پھر چونکہ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی سعی و عمل کے اثرات اپنا الگ تھلگ کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ وہ مختلف تغیرات و تبدلات اور گوناگوں شکلوں سے مادّی اشیاء کے ساتھ قائم و وابستہ ہوتے ہیں لہٰذا ہر انسان کے کام و عمل کے مفید اثرات کا اس کے لئے مخصوص ہونے کا

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

عملی طور پر مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قدرتی شے اس کے لئے مخصوص ہو جس کے ساتھ اس کے مفید کام و عمل کے نفع بخش اثرات قائم و وابستہ ہو گئے ہوں ' قرآن مجید کے اس اصولی تصوّر کی بعض جزوی تفصیلات احادیثِ نبویّہ میں بیان فرمائی گئی ہیں ایک حدیث نبویؐ کے کلمات اس طرح ہیں :۔

"مَنْ اَحیا اَرْضًا مَیْتَۃً فَھِیَ لَہٗ" جس نے کسی مردہ یعنی بنجر و بے کار پڑی زمین کو زندہ یعنی آباد کیا اور قابلِ کاشت بنایا وہ اس کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو گئی اب اس کی اجازت کے بغیر دوسرا کوئی اس میں مالکانہ تصرف نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی خطہ زمین کو آباد کرتا اور قابلِ کاشت بناتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سعی و محنت کے اثرات قائم ہوتے اور سب کو نظر آتے ہیں '

© rasailojaraid.c

دراصل یہی اثرات وہ سبب ہیں جس کی بناپر اس شخص کو زمین کے اس ٹکڑا سے انتفاع و استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے جسے حقِ ملکیت کہا جاتا ہے۔ مختصر خلاصہ یہ کہ جو منفعت بخش مادّی شے اپنی قدرتی حالت پر برقرار ہو اس کے متعلق کسی انسان کے حق کی بنیاد اسلام کی رو سے وہ مفید اثرات و تغیرات ہیں جو اس انسان کی سعی و محنت سے پیدا ہو کر اس قدرتی شے کے ساتھ قائم اور وابستہ ہو گئے ہوں چنانچہ جب تک وہ اثرات قائم رہتے حق قائم رہتا اور جب وہ زائل اور ختم ہو جاتے حق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اور دوسری قسم کی اشیاء جو پہلے سے ضرور کسی نہ کسی کی ملکیت میں ہوتی اور ان سے استفادے کا حق لازماً کسی نہ کسی شخص کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور لوگ مختلف ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت آپس میں ان کا تبادلہ اور لین دین بھی ضرور کرتے ہیں ایسی اشیاء کے متعلق اسلام کا اصول یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شے ایک شخص کے حق ملکیت سے نکل کر دوسرے کے حقِ ملکیت میں اس وقت داخل اور منتقل ہوتی اور دوسرا اس وقت اس کا حقدار بنتا ہے جب پہلے شخص کو اس

© rasailojaraid.c

کی شے کا ایسا عوض پیش کر دیا جائے جو افادیت ' مالیت اور قدر و قیمت میں اس شے کے برابر و مساوی ہو ' بالفاظ دیگر تجارتی لین دین میں ایک شخص دوسرے کی شے کا اس وقت مستحق قرار پاتا ہے جب اس کی طرف سے دوسرے کے لئے قدر و قیمت کے لحاظ سے ویسی ہی شے موجود ہو ' دیکھا جائے تو اسلام کا یہ اصول بھی انسانی فطرت اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے کیونکہ ہر انسان فطرۃً یہ چاہتا ہے کہ اسے اس کی مملوکہ شے کا کسی نہ کسی شکل میں ضرور معاوضہ ملے خواہ وہ مادّی و دنیوی معاوضہ ہو یا روحانی و اخروی معاوضہ ' اسی طرح انسانی مساوات و عدل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہر انسان کو اس کی چیز کا ضرور اور پورا معاوضہ ملے جو اس کا فطری حق ہے اور دراصل مالی لین دین کے معاملہ میں فریقین کی حقیقی رضامندی کا معروضی معیار بھی یہی معاوضہ ہے۔ چنانچہ اسلام نے اپنے اسی مذکورہ اصول کی بنا پر مالی لین دین کی ایسی شکلوں کو جائز و مشروع ٹھہرایا جن میں ہر فریق کے لئے اس کے مال کا عوض اور بدل موجود تھا اور اس کی وجہ سے فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی تھی ' اور اس کے برخلاف ان شکلوں کو ناجائز و ممنوع قرار دیا جن میں ایک فریق کے لئے اس کے مال کا مادّی یا روحانی عوض اور بدل موجود نہ تھا ' مثلاً اسلام نے بیع و شراء کے طریقہ کو جائز اور مشروع ٹھہرایا جس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا عوض موجود ہوتا ہے ایک کے لئے کسی جنس یا سامان کی شکل میں اور دوسرے کے لئے بطور قیمت زر و نقدی وغیرہ کی شکل میں ' اجارے کے معاملہ کو جائز ٹھہرایا جس میں اجیر اور مستاجر دونوں کے لئے اس کی چیز کا معاوضہ موجود ہوتا ہے ایک کے لئے خدمت اور محنت کے نفع بخش اثرات کی شکل میں اور دوسرے کے لئے نقدی وغیرہ کی شکل میں ' قرض کے طریقہ کو جائز و مشروع ٹھہرایا جس میں قرض دار کے لئے قرض کا مال ہوتا اور قرض خواہ کے لئے وقتِ مقرر کے بعد اس مال کی مثل ہوتی ہے ' صدقے ' ہبہ ہدیئے کے طریقہ کو جائز ٹھہرایا جس میں اگرچہ دینے والے

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

کے لئے مالی اور مادّی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لیکن اس کے علم واعتقاد کے مطابق اخروی اجر وثواب اور دنیوی شہرت وعزت کی شکل میں روحانی اور معنوی معاوضہ ضرور موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ رضا وخوشی کے ساتھ اپنی چیز دوسرے کو دے دیتا ہے' دوسرے کا مال لینے کے جن طریقوں کو اسلام نے ناجائز وممنوع ٹھہرایا ان میں سرقہ' غصب' خیانت' رشوت' قمار اور ربٰو کا واضح طور پر ذکر ہے ان سب طریقوں میں ایک شخص دوسرے کا جو مال لیتا ہے بغیر عوض اور بلا بدل کے لیتا ہے لہٰذا ان میں دوسرے کی رضامندی موجود نہیں ہوتی جس کے بغیر دوسرے کا مال لینا جائز اور حلال نہیں ٹھہرتا' حدیث نبویؐ ہے " لایحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسہ " ترجمہ "کسی مسلم کا مال دوسرے کے لئے حلال وجائز نہیں مگر یہ کہ وہ طیب خاطر اور قلبی رضا وخوشی سے اس کو دے "۔

قرآن مجید کی جس آیت میں ایک دوسرے کا مال بلا عوض اور بغیر رضامندی لینے کی واضح اور قطعی ممانعت ہے وہ سورۃ النساء کی یہ آیت ہے یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَاْ کُلُوْ ا اَموَ الَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ترجمہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل وناحق طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کے ذریعے ہو جس میں فریقین کی رضامندی پائی جاتی ہو۔ اس آیت قرآنی میں جو لفظ باطل ذکر ہوا ہے وہ حق کی ضد ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ ناحق سے کیا جاتا ہے بعض مفسرین کرامؒ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے باطل کی تعریف کے متعلق حضرت عبدؓ اللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے " الباطل ھو کل مایوخذ من الانسان بغیر عوض " ترجمہ باطل وہ ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض لیا جائے۔

علامہ رشید رضا نے تفسیر المنارؒ میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے باطل کے متعلق لکھا ہے " اما الباطل مالم یکن فی مقابلہ شئی حقیقی " پس باطل وہ

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

مال ہے جو کسی حقیقی شے کے بالمقابل نہ ہو اور چونکہ از روئے عدل کسی مال کا صحیح عوض اور بدل وہ ہوتا ہے جو افادیت ' مالیت اور قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو لہٰذا آیتِ مذکورہ کے پہلے حصے کا مطلب ہوا اے مسلمانوں تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ایسے عوض و بدل کے بغیر نہ لو جو مالیت اور قدر و قیمت میں لئے ہوئے مال کے مساوی و برابر نہ ہو ورنہ ایسا لینا باطل اور ناحق ہو گا۔ اور چونکہ سرقہ ' غصب ' خیانت ' رشوت ' جوئے اور ربٰو میں ایک فریق دوسرے کا مال بغیر عوض و بدل کے لیتا ہے لہٰذا اس آیت کی رو سے وہ سب باطل اور ممنوع قرار پاتے ہیں ' پھر آیت کے دوسرے حصہ میں لفظ اِلّا کے بعد مالی لین دین کے اس طریقے کا بیان ہے جو باطل نہیں حق ہے اور وہ طریقہ ایسی تجارت اور بیع و شراء کا طریقہ ہے جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو کیونکہ جہاں تک ظاہری اور زبانی رضامندی کا تعلق ہے وہ تو معاملہ ربٰو میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن وہ قلبی اور حقیقی رضامندی نہیں ہوتی بلکہ مجبوری کے تحت ظاہری ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ کہ جس کے پاس حسب ضرورت اپنا مال ہو وہ کسی سے قرض نہیں لیتا ' اسی طرح جس ضرورت مند کو قرضِ حسنہ مل سکتا ہو وہ کبھی سود پر قرض نہیں لیتا سود پر تو قرض بادلِ نخواستہ اور مجبوراً ہی لیا جاتا ہے ' دراصل حقیقی رضامندی کا معروضی معیار وہ مساوی عوض و بدل ہے جو دینے والے کو اپنی چیز کے مقابلہ میں ملتا ہے ' جہاں تک معاملۂ تجارت کا تعلق ہے جس میں دو فریقوں کے مابین خرید و فروخت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس کے اندر ہر فریق کو اس کی چیز کا عوض و بدل ملتا ہے ایک کو یعنی خریدار کو کسی جنس یا ساز و سامان کی شکل میں اور دوسرے کو ثمن یعنی نقدی وغیرہ کی شکل میں ' البتہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دکاندار ' خریدار کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بازار کے عام نرخ سے زیادہ داموں چیز خریدار پر فروخت کر دیتا اور وہ اسے بادل نخواستہ مجبوراً لے لیتا ہے یا اس کے برعکس بعض دفعہ دکاندار اپنی کسی

© rasailojarai
© rasailojarai
© rasailojarai

ضرورت کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ بازار کے عام نرخ سے کم پر اپنی چیز فروخت کر دے لہٰذا گاہک اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم قیمت پر چیز خرید لیتا اور دکاندار بادل نخواستہ اس کو دے دیتا ہے' ایسی دونوں صورتوں میں معاملہ کے ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی صرف ظاہری موجود ہوتی ہے لہٰذا آیتِ مذکورہ کے دوسرے حصہ کی رو سے یہ معاملہ درست نہیں ٹھہرتا کیونکہ اس میں ایک فریق کو اس کا پورا حق نہیں ملتا بلکہ ناقص و ادھورا ملتا ہے جو عدل کے خلاف ہے' قرآن مجید کی متعدد آیات میں فرمایا گیا ہے کہ خرید و فروخت میں ماپ تول عدل کے مطابق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ہونا چاہئے اور اس میں ذرہ برابر کمی بیشی نہ کی جائے اور فرمایا لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دی جائیں کیونکہ بخس و کمی سے حق تلفی ہوتی ہے۔ اس سے معاملہ عدل کی بجائے ظلم کا رنگ اختیار کر لیتا اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

مختصر خلاصہ یہ کہ لین دین کے مالی معاملات میں اسلام کے نزدیک جس بنا پر ایک شخص دوسرے کی چیز کا حق دار قرار پاتا ہے وہ ہے لینے والے کی طرف سے قدر و قیمت کے لحاظ سے مساوی عوض و بدل اور دینے والے کی جانب سے حقیقی رضا مندی جو آپس میں لازم و ملزوم ہیں چنانچہ جس معاملے میں یہ چیز موجود نہ ہو وہ معاملہ باطل ٹھہرتا ہے۔ چونکہ معاملہ ربٰو میں یہ چیز موجود نہیں ہوتی' یعنی یہ کہ اس میں مُقرِض اپنے مقروض سے قرض کے اصل مال پر جو بھی زائد مال لیتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے کوئی مال موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس زائد مال کا حق دار نہیں ٹھہرتا اور چنانچہ جو لیتا ہے ناحق لیتا اور دوسرے کی حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے جسے قرآن حکیم نے اپنی آیت لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ میں معاشی ظلم سے تعبیر کیا ہے' مطلب یہ کہ اصل مال پر زائد لے کر نہ تم اپنے مقروض پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل مال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرے' ظلم حرام ہے لہٰذا جو معاملہ ظلم پر مبنی ہو وہ بھی لازماً حرام ہے' واضح رہے کہ ربٰو کے حرام ہونے کی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

جو وجہ میں نے عرض کی ہے یہ میری طبع زاد نہیں بلکہ یہ وہی وجہ ہے جو صدیوں پہلے بہت سے مفسرین قرآن نے آیات ربٰو کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے چند حوالے عرض کئے جاتے ہیں ملاحظہ فرمایئے! علامہ جصاص حنفیؒ اپنی فقہی تفسیر "احکام القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں "ان تلک الزیادۃ المشروطۃ انما کانت رباً فی المال العین لانہ لا عوض لھا من جھۃ المقرض" مقرض کے حقیقی مال میں یہ مشروط زیادتی ربٰو ہے کیونکہ مقرض یعنی قرض دینے والے کی طرف سے اس زیادتی کا کوئی عوض نہیں ہوتا۔ (۲) علامہ ابوبکر بن العربی مالکیؒ اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں "المراد بالربٰو فی الآیۃ کل زیادۃ لم یقابلہا عوض" اس آیت میں ربٰو سے مراد ہر وہ مال میں زیادتی ہے جس کے مقابل عوض نہ ہو۔ علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی ، اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں رقمطراز ہیں "الربا ھو فضل مال خال عن العوض فی معاوضتہ مال بمال" مال سے مال کے معاوضہ میں جو فاضل مال عوض سے خالی ہو ربٰو ہے۔ علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں "الربٰو فی الشرع عبارۃ عن فضل مال لا یقابلہ عوض فی معاوضتہ مال بمال" شریعت میں ربٰو کا مطلب ہے مال سے مال کے معاوضہ میں وہ زائد مال جس کے مقابلہ میں عوض موجود نہ ہو۔ امام فخرالدین الرازیؒ کی تفسیر کبیر میں عبارت ہے "الربٰو یقتضی اخذ مال الانسان من غیر عوض" ربٰو کی فطرت میں یہ اقتضاء ہے کہ کسی انسان کا مال بغیر عوض کے لیا جائے۔ (جاری ہے)

❁❁❁

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

عام طور پر ہمارے یہاں

توحید علمی و نظری — یعنی — توحید فی العقیدہ

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہٗ توجہ نہیں دیجاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سُورۂ زمر تا سُورہ شوریٰ پر تدبّر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی فرضیت

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، اور

شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صُورت دیدی

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ○ صفحات ۱۹۲ ○ عمدہ سفید کاغذ ○ دیدہ زیب کور

هدیہ: ۱۵ روپے، علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ انجمن خدّام القرآن: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور ۱۴

© rasailojarai

© rasailojarai

© rasailojarai